ASPECTS OF THE REDEMPTIVE ACT OF CHRIST

BY REVD. W. H. T. GAIRDNER.

از

پادری ڈبلیو۔ ایچ۔ ٹی۔ گیرڈنر صاحب بی۔ اے

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی۔ لاہور

1958

مسیح کی موت کے مختلف پہلو

من تصنیف

پادری ڈبلیو۔ ایچ۔ ٹی گیرڈنر صاحب بی اے

پنجاب رلیجس بک سوسائٹی

انارکلی۔ لاہور

تعداد ۱۰۰۰ ۱۹۵۸ء بار دوم

فہرست مضامین

دیباچہ

مسیحیوں کا ایک عجیب اور حیرت انگیز عقیدہ ہے کہ ایک خاص فعل جو ایک خاص شخص کے ذریعہ سے ایک خاص وقت پر وقوع میں آیا ہر زمانہ کے کل آدمزاد کے لئے از بس اہم تھا اور ہے۔ اس سے ہمارا اشارہ یسوع مسیح کی زندگی۔ موت اور پھر جی اُٹھنے کی طرف ہے۔ تقریباً دو ہزار سال کا عرصہ گزرا کہ یہ واقعہ معرضِ ظہور میں آیا۔

اب بخوبی واضح ہے کہ جس فعل کا مرکزی اور اعلیٰ نقطہ خیال موت ہو اور جس کا اثر ایسا عالمگیر ہو اُس کو ہم سرسری نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ برعکس اِس کے اُس کے مختلف پہلو ہوں گے جن پر الگ الگ غور کرنا لازم آئے گا اور اُن پر الگ الگ غور کرنے سے فائدہ بھی ہوگا۔ صرف اِسی طریق سے ہم اُس فعل کے فوائد معلوم کر سکیں گے۔ لیکن اُس پر سرسری طور سے نظر ڈالنا ہمیں اُس کے فوائد سے محروم رکھے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس بارے میں مسیحی مفسّرین نے مسیح کی کفّارہ بخش موت کی تفسیر کرنے میں اکثر غلطی کی۔ یعنی اس کے گہرے سے گہرے معنی دریافت کرنے کے شوق میں اس کے دوسرے پہلوؤں کے فوائد کو انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ اور بعض اوقات اس کو محض ایک گُر بنا لیا۔ اُن کا یہ عمل اس وجہ سے بھی غلط تھا کہ اُن دیگر پہلوؤں کی مدد کے بغیر اِس کے گہرے معنی بھی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ کیونکہ ہم یہ نہ سمجھیں کہ خدا کے کسی فعل میں صرف ایک ہی پہلو لازمی اور ضروری ہوتا ہے۔ اور دیگر پہلو غیر ضروری اور فضول بطورِ ضمیمہ یا تتمہ

ہوتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ سارے پہلو ایک دُوسرے سے وابستہ ہیں اور ان میں جو سب سے گہرا ہے وُہ دُوسروں سے مُلحق ہے ۔

اِس لئے اِن اوراق میں ہم اِس کے ہر ایک پہلو پہ الگ الگ غور کریں گے ۔اور زیادہ سادہ اور آسان پہلو سے شروع کر کے زیادہ گہرے کی طرف جائیں گے ۔ اس فعل کے پُورے معنی ان سب پہلوؤں کے اجتماع سے حاصل ہوں گے ۔ اِس تجویز سے ایک یہ فائدہ ہو گا ۔کہ جو لوگ اپنی توہّمیت ۔ تعصّب یا رُوحانی ناتجربہ کاری کے باعث زیادہ گہرے پہلوؤں کو سمجھنے کے ناقابل ہیں، وُہ ہی ان سادہ پہلوؤں کو سمجھ سکیں گے ۔ اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ ایسا کرنے سے بھی اُن کے خیالات پر بڑا اثر ہو گا اور وُہ بہت بدل جائیں گے ۔ اُن کے ایمان اور اُن کی زندگی پر یہ اثر پڑیگا اور یُوں وُہ بتدریج پُورے ایمان تک ترقی کرتے جائیں گے ؞

مسیح کی موت کے مختلف پہلو

پہلا پہلو

مسیح کی موت شریعت کی تکمیل

"موت زندگی کا دروازہ"

مسیح کے اعلیٰ و افضل اقوال میں سے ایک یہ قول ہے جس کا استعمال نہایت وسیع اور جس کے معنی نہایت عمیق ہیں۔ وُہ قول یہ ہے۔

"جو کوئی اپنی جان بچانے کی کوشش کرے وُہ اُسے کھوئے گا۔ اور جو کوئی اُسے کھوئے، وُہ اُس کو زندہ رکھے گا۔"

ہم اِس قول کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ یہی ایک واحد قول ہے۔ جو چاروں اناجیل میں قلمبند ہُوا۔ اور نیز اس سے بھی کہ یہ چار مختلف موقعوں پر مستعمل ہُوا۔ ہم اُن مختلف موقعوں کا ذکر کریں گے۔ کیونکہ یسُوع مسیح نے اس قول کو ایک نقش بہ سنگ گرہ کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ ہر موقعہ پر مختلف الفاظ ہیں۔ اور یہ از بس سبق آموز ہیں۔

مذکورہ بالا آیت لُوقا ۱۸: ۳۳ میں مندرج ہے۔ اور اُس تقریر میں آتی ہے جس میں دُنیا کے انجام کا ذکر ہے کہ وُہ کیسے ناگہاں نوعِ انسان پر آئے گا۔ ہم نے اس کو مقدّم اِس لئے رکھا کہ اس میں یہ قانون کہ "موت زندگی کا دروازہ ہے"، نہایت عام الفاظ میں بیان ہوُا ہے۔

دُوسرا موقعہ جہاں یہ قول آیا وُہ نصیحت واختیار ہے جو مسیح نے بارہ رسُولوں کو پہلی دفعہ رسالت پر بھیجتے وقت دیئے۔ (متی ۱۰: ۳۹)

"جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے، اُسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوتا ہے اُسے بچائے گا۔"

پھر جب اُس نے اپنے شاگردوں کو پہلی دفعہ اپنی موت کی خبر دی۔ اور پطرس نے اُس کو ایسی موت کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کی وہاں یہ قول ان الفاظ میں آیا ہے۔ (متّی ۱۶: ۲۵)

"جو کوئی اپنی جان بچانا چاہے، اُسے کھوئے گا۔ اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئے گا، اُسے پائے گا۔"

اور آخرکار جب اُس کی اٹل جلد واقع ہونے والی موت اور قربانی کی جھلک اُس کی رُوح پر پڑ رہی تھی۔ یعنی اُس کے پکڑوائے جانے سے ایک یا دو روز پہلے (یُوحنّا ۱۲: ۲۵)۔

"جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے وُہ اُسے کھو دیتا ہے۔ اور جو دُنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے، وُہ اُسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھیگا۔"

دُوسرے اور تیسرے موقعوں پر یہ الفاظ "میری خاطر" اِس لئے مستعمل ہوئے کیونکہ وُہ اپنے پیرؤوں سے خود نثاری کا مطالبہ کرتا تھا لیکن یہ بھی بخوبی واضح ہے، کہ اُس نے اِس قانون کو عالمگیر سمجھا۔ خاص کر

چوتھے اور آخری موقعہ کے قرینے سے یہ ظاہر ہے، جہاں یسوع مسیح نے خاص طور پر یہ اعلان کیا کہ سب سے اوّل و مقدّم وُہ خود اس قانون کے تحت میں آیا۔ اور اس کے بعد اور اُس میں اُس کے شاگرد اس کے تحت میں آئے۔ اس لئے ہم ان چاروں عبارتوں کو عام اور عالمگیر معنی میں لیں اور ان الفاظ "میری خاطر"، کو جن سے اس قانون پر ایک حد عائد ہوتی ہے، نظر انداز کریں یا ان الفاظ کے معنی یوُں وسیع کر دیں۔ "سارے عالم میں سب سے اعلیٰ اور افضل شے کی خاطر"۔

ان چاروں اقوال میں دو ظاہرا خلافِ عقل خیال یا مُعمّے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دو جُملوں میں منقسم ہے۔ ہماری خاص غرض دُوسرے خلافِ عقل خیال سے ہے۔ لیکن اس کے ٹھیک معنی سمجھنے کے لئے پہلے کو پرکھنا ضرور ہے۔ پہلا یہ ہے۔

جو کوئی بچانے کی کوشش کرے
جو کوئی بچاتا ہے
جو کوئی بچانا چاہے
جو عزیز رکھتا ہے
} اپنی جان ۔ اُسے کھوئے گا

گویا وُہ یہ کہتا ہے ؛۔ توقع تو یہ ہو سکتی تھی کہ آدمی کی زندگی جو دُنیا میں سب سے بیش بہا شئے اُس کے پاس ہے۔ اور وُہ بھی ایسی شئے جو ایک ہی ہے۔ ایسی شئے کو تو ہر ممکن طریقے سے محفوظ رکھنا فرض تھا۔ یہ توقع ہو سکتی تھی کہ اُس کے بچانے کے لئے آدمی سب کچھ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو گا۔ اُس کو پانے کی کوشش کرے گا، اُس کو بچانا چاہے گا۔ اور اُس کو عزیز رکھے گا۔ لیکن ہم کو یہ سُن کر تعجب پیدا ہوتا ہے کہ جو ایسا کرتے

ہیں وُہ اپنا مقصد کھو دیتے ہیں اور اُس زندگی کے کھونے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں ۔ ایسا کیوں کہا گیا ؟ جن مختلف الفاظ میں یہ قول ہم کو پہنچا اُنہیں کے ذریعے اس کا جواب دینے میں مدد ملتی ہے ۔ زندگی کی قدر و قیمت کا انحصار اس بات پر ہے کہ اُس کا حاصل کیا ہے ؟ وہ کیسے بسر ہوتی اور کس مقصد کے حصول میں وُہ کوشاں ہے ۔ اور اس بڑے آدمی کی زندگی ، گو وُہ واحد زندگی ہے (زبور ۲۲ : ۲۰) ان ہی امور کی بنا پر قیمتی ہے پس اگر آدمی بلا لحاظ ان اُمور کے محض زندگی ہی کی خاطر زندگی کو "عزیز رکھنا" محض اسی کی خاطر اُسے "بچانا چاہتا" اگر وُہ ان اُمور سے محروم ہو کر اُسے پا بھی لے تو وُہ اُسے کھوتا ہے ۔ کیونکہ اُس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس نے ایسی شئے کو پایا جو پانے کے قابل نہ تھی ۔ اُس نے ایسی شئے کو بچایا ، جو بچانے کے قابل نہ تھی ۔ ایسی شئے کو عزیز رکھا ۔ جو عزیز رکھنے کے قابل نہ تھی ۔ ہماری زندگی بھی اس قابل نہیں کہ سب کچھ کھو کر یہ حاصل کی جائے ۔

سپارٹا کے اُس سپاہی نے زندگی کو ایسا قیمتی سمجھا اور فارسی فوج کے سامنے سے تھرماپولی کے درّہ کو چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگ گیا ۔ اُس نے اپنی جان کو عزیز رکھا اور اُس کے بچانے کی کوشش کی اور اُسے بچا بھی لیا لیکن جن وجُوہ کی بناء پر زندگی قیمتی سمجھی جاتی تھی اُن سب کو کھو دیا یعنی وطن کی محبّت اور دُوسروں کی نگاہ میں عزّت ۔ کیونکہ اپنے گھر واپس جانے پر اُس نے معلوم کیا کہ سب نے اُس کو ترک کر دیا ۔ اور کسی نے اُس کو عزّت کی نگاہ سے نہ دیکھا اُس کو پتہ چل گیا کہ جس زندگی کو اُس نے بچایا وُہ اُس کے کھوئے جانے سے بھی بدتر تھی ۔ اور فوراً جا کر اپنے ہاتھوں خودکشی کر لی ، کیونکہ اُس کی زندگی نکمّی سے بھی نکمّی ہو گئی تھی ۔

جب ہم نے اِسے سمجھ لیا تو دُوسرا جُملہ بھی جو خلافِ عقل نظر آتا تھا سمجھ میں آ جاتا ہے ۔

جو کوئی اپنی جان کھوئے ۔	اُسے بچائے گا
جو کوئی اپنی جان کھونا چاہے ۔	اُسے پائے گا
جو اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے	اُسے محفوظ رکھے گا

اس ظاہرا خلافِ عقل جملے کے الفاظ پہلے سے بھی زیادہ ناگوار نظر آتے ہیں ۔ لیکن جو سُراغ ہم کو مل گیا اُس کے ذریعے اس کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں ۔ جو کوئی اصُول کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے ، اُس اصُول کو بچاتا ہے ۔ جو شخص زندگی کے مقاصد پر اپنی نظر جماتا ہے یعنی ایسے مقاصد پر جن کی خاطر اُس کو ہستی حاصل ہے ، اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر بھی اُن سے قطع تعلّق نہیں کرتا ، ایسا شخص اس کھونے ہی میں اپنی زندگی پاتا ، بچاتا اور محفوظ رکھتا ہے ۔

تھرماپولی کے اُن بہادروں کی طرح جنھوں نے سپارٹا کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں ، اُن کے ضمیر نے اُن کی تعریف کی اور آخر کار غیر فانی شہرت حاصل کی ۔

خود یسُوع مسیح نے اس قانون کا اطلاق کیسے کیا ؟ یہ توضیح ہے کہ اس قانُون کا اطلاق غیر محدُود ہے اور ہمیشہ جسمانی مَوت ہی پر یہ دال نہیں ۔ مثلاً ایک آدمی ایک اچھے عہُدہ سے اس لئے انکار کرتا ہے کہ اُس کے ساتھ ایک ذلیل شرط لگی ہوئی ہے ۔ اُس نے اپنا نقصان تو کیا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایسے وقیع اور منفعت بخش عہُدہ کا انکار کرنے سے وہ اپنی زندگی سے عداوت رکھتا ہے ۔ لیکن فی الحقیقت اُس نے زندگی

کو محفوظ رکھا اور بچایا۔ کیونکہ ایسی آزمائش کے بعد خود اُس کی زندگی، اُس کی رُوح دس گنا تیزی سے چمکنے لگ جاتی ہے۔ اور پہلے سے زیادہ مضبوط اور دولتمند ہو جاتی ہے۔ برعکس اس کے اگر وُہ اس عہدہ کو قبول کر لیتا تو اُس کی زندگی، اُس کی رُوح (جس کی خاطر اُس نے اُسے قبول کیا) مفلس ہو جاتی، اور اُسے ضربِ کاری لگ جاتی۔ ویسے ہی جو مُبشّر شہرت کو خلوصِ قلبی اور دیانت داری پر، جو فاتح فتح کو عدل پر، اور جو سوداگر زر کو انسانیت پر ترجیح دیتا ہے، انجام کار ان لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کی زندگی ہیچ تھی۔ اُنہوں نے سارا جہان تو حاصل کر لیا۔ لیکن اپنی جان کو ضائع کیا عین اُسی زندگی کو جس کی خاطر اُنہوں نے اعلیٰ مقاصد کا خُون کیا تھا۔

پس جسمانی موت اِس عالمگیر قانُون کا لازمی نتیجہ نہیں۔ البتہ اس کے اعلیٰ اطلاق میں یہ موت داخل ہے۔ اس قانون کی غایت یہ ہے کہ آدمی نہ صرف زندگی کے لوازمات کو کھونے پر راضی ہو بلکہ عین اُس زندگی کے کھونے پر، وُہ اصُول کو ترجیح دے۔ اُس اعلیٰ نیکی یعنی خُدا کو جسمانی زندگی پر فوقیت دے۔

اگر یسُوع مسیح اعلیٰ نمونہ ہے اور اگر اُس نے اِس اصُولی قانُون کا جس کو اُس نے خود مقرر کیا، اعلیٰ نمونہ پیش کرنا چاہا تو وُہ اُس کا مجازی نمونہ پیش نہ کرے گا بلکہ حقیقی۔ اس کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا اُس کا لازم تھا۔ یعنی اس امر کا کہ اپنے اعلیٰ مقصد کے ترک کرنے کی نسبت طبعی موت کو قبُول کرے اور نہ صرف وُہ ایسی ترجیح کی آرزو رکھے بلکہ خلوص دلی سے مرنے پر آمادہ ہو اور فی الواقع مر بھی جائے۔ ورنہ وُہ اِس ظاہر اخلاقِ عقل خیال کی اعلیٰ صداقت ہم پر کیسے ثابت کرتا کہ جو خُدا کی خاطر فی الواقع مرتا اور اپنی

جان کھوتا ہے ، وہ فی الواقع اور فی الحقیقت اُسے بچاتا ہے ۔ جی اُٹھنے سے پیشتر اُس کو مرنا ضرور تھا ۔ اُس کے مرنے اور جلال میں پھر جی اُٹھنے کے ذریعہ سے ہی اس صداقت کی تصدیق ہمیشہ کے لئے حاصل ہوگئی۔

پس اُس کے لئے یہ آیاتِ موت ، فی الواقع اور ظاہراً ناکامیابی اور ذلیل موت ہی کے معنی رکھتی تھیں ۔ ورنہ وہ ہمارے لئے اعلیٰ اور کامل نمونہ نہ ٹھہرتا ۔ پھر مسیح کی موت پر یہ اعتراض کرنا اور کہنا کیسا نامناسب ہے کہ اپنے عظیم و جلیل مرتبہ کے لحاظ سے ایسی موت اُس کو شایاں نہ تھی ۔ بلکہ برعکس.... لیکن اِن آیات کا قرینہ ہی ہمارے اس معنی کی تائید کرتا ہے ۔

دُوسرا پہلُو

مسیح کی موت "موت تک محبّت" کی تکمیل

ہمیں اس امر کے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ دُوسروں کی خاطر جان نثار کرنا جہان میں اخلاقی طور پر سب سے افضل ہے۔ اور سب لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ "موت تک محبّت کرنا" ہی وُہ اشرف صفت ہے، جو انسانیت کا خاصہ اور مابہ الامتیاز ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہو تو یہ امر مستلزم ہُوا کہ ابنِ آدم، جو پاک اور انسانِ کامل تھا، اِس صفت کا مظاہرہ کرے۔ یہ خیال اس سے مُشابہ ہے جس کا ذکر فصلِ ماقبل میں ہُوا۔ یعنی یہ کہ کامل نمونہ کے شخص کے لئے یہ ضرور ہے کہ وُہ نیکی کے اعلیٰ و افضل پہلوؤں کو اپنی ذات سے مُنکشف کرے ورنہ وُہ کُل زمانوں اور تمام ملکوں کے لئے نمونہ کیسے ہو سکتا ہے ؟

مقام تعجّب ہے اور افسوسناک بھی، کہ اِس کامِل انسان یسُوع میں بعض لوگ اسی صِفت کا انکار کرتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ تعجّب انگیز بات یہ ہے کہ وہی لوگ جو اُس کی عزت و احترام کے مُدّعی ہیں اور اپنے کو بڑا غیرتمند کہتے ہیں وُہی ایسا کرتے ہیں۔

محبّت دُنیا میں سب سے افضل شئے ہے۔ اور اس کا اعلیٰ درجہ اور غایت اِظہار "موت تک محبّت" ہے۔ اس لئے ممکن تو درکنار، یہ امر لابُد تھا

کہ یہ نمونہ کا شخص ایسی محبّت ظاہر کرے جو موت سے ڈرے نہ رہے۔ اور جو پہلے محض ممکن تھا اب وقوع میں آگیا۔ اِس لئے ہم اُس کی عزّت و تعظیم میں اپنے سر جھکائیں۔

مسیح نے اپنے افضل اقوال میں سے ایک میں اس صداقت کی خود تصدیق کی۔ کیونکہ اُس نے فرمایا "اِس سے زیادہ محبّت کوئی شخص نہیں کرتا کہ اپنی جان اپنے دوستوں کے لئے دے دے"

اور ایک دوسرے مقام میں اُس نے یہ کہا "اچھّا چرواہا مَیں ہوں۔ اچھّا چرواہا بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہے۔ مزدور جو نہ چرواہا ہے نہ بھیڑوں کا مالک۔ بھیڑیئے کو آتے دیکھ کر بھیڑوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اور بھیڑیا اُن کو پکڑتا اور پراگندہ کرتا ہے۔ وہ اس لئے بھاگ جاتا ہے کہ مزدور ہے اور اُس کو بھیڑوں کی فکر نہیں۔ اچھّا چرواہا مَیں ہوں۔ جس طرح باپ مجھے جانتا ہے اور مَیں باپ کو جانتا ہوں۔ اِسی طرح مَیں اپنی بھیڑوں کو جانتا ہوں اور میری بھیڑیں مجھے جانتی ہیں۔ اور مَیں بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہوں" (یوحنا ۱۰: ۱۱ سے ۱۵)

جو بہادر ازمنۂ سابقہ میں گذرے، یہ الفاظ اُن سب کے کارہائے نمایاں کی ہمیں یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً ایک باپ جو اپنے بچّوں کو بچانے کے لئے آگ سے جلتے ہوئے گھر میں جا گھسا۔ کسی قبیلہ کا وہ فرد جس نے اپنے سرداروں کو پکڑوانے کی بجائے اپنی موت کو ترجیح دی۔ وہ جوان جو ڈوبتے ہوئے لوگوں کو بچانے کے لئے سمندر کی لہروں میں جا کودا۔ ایک سپاہی جو اپنے دستے کو بچانے کی خاطر تنہا اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ اور دیگر ہزارہا کارنامے انسان کی اس اعلیٰ صفت کے اظہار کے نمونے ہیں، اور یہ بالرضا موت جس قدر

زیادہ ہولناک ہوگی اُسی قدر زیادہ ذوالجلال ہوگی۔ اور جب یہ مَوت بالرضا ہونے کے علاوہ طویل بھی ہو تو کتنی زیادہ پُرجلال نہ ہوگی؟ پھر اگر اس سے بچ نکلنے کا بھی کسی نہ کسی وقت امکان ہو، تو کیا ہم یہ نہ کہیں گے کہ یہ محبت کا کمال تھا؟ کیا ہم ایسے بہادر کو جلال کا اعلیٰ سے اعلیٰ تاج نذر نہ کریں گے؟

اسی امر کو ذہن نشین کر کے ہم مسیح کی مَوت کو جلالی سمجھتے ہیں۔ جو لوگ جلال کے حقیقی معنی سے ناآشنا ہیں، وہی اُس کا انکار کرتے ہیں۔ بائبل میں آیا ہے۔ "ہم اُس کو دیکھتے ہیں ..... یعنی یسوع کو .... کہ جلال اور عزت کا تاج اُسے پہنایا گیا ہے تاکہ خُدا کے فضل سے وُہ ہر ایک آدمی کے لئے مَوت کا مزہ چکھے"۔

بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ یسُوع کو ایسے تاج سے مزیّن دیکھ کر ہی دُنیا کو لفظ "محبّت" کے معنی سمجھ میں آئے۔ "ہم نے محبّت کو اسی سے جانا ہے کہ اُس نے ہمارے واسطے اپنی جان دے دی۔ اور ہم پر بھی بھائیوں کے واسطے جان دینی فرض ہے"۔ (۱۔ یُوحنّا ۳: ۱۶)

یسُوع کی اس محبّت کے بارے میں ایک اَور بے نظیر بات بھی پائی جاتی ہے۔ جس سے ہر ایک شخص کو یہ خیال گزرتا ہے کہ یہ محبّت شخصی تھی۔ اُس نے اپنے تئیں شخصی طور پر اس کے لئے قربان کر دیا۔ چنانچہ مقدّس پَولُس نے یہ کہا "مَیں مسیح کے ساتھ مصلوب ہُوا ہُوں۔ اور اب مَیں زندہ نہ رہا۔ بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے۔ اور مَیں جو اب جسم میں زندگی گزارتا ہُوں تو خُدا کے بیٹے پر ایمان لانے سے گزارتا ہُوں۔ جس نے مجھ سے محبّت رکھی۔ اور اپنے آپ کو میرے لئے مَوت کے حوالے کر دیا"۔
(گلتیوں ۲: ۲۰)

ذرا سوچئے کہ اگر کوئی اپنے عزیزوں یا اپنے دوستوں کے لئے جان نثار کرے اور وہ محبّت اعلیٰ درجے کی سمجھی جائے تو کتنی اعلیٰ وہ جان نثاری ہوگی جو دشمنوں کی خاطر ہوئی۔ فی الحقیقت ایسی محبّت انسانی طاقت سے اعلیٰ ہوگی۔ کیونکہ رومیوں ۵ : ۷ میں لکھا ہے "کسی راستباز کی خاطر بھی مشکل سے کوئی اپنی جان دے گا۔ مگر شاید کسی نیک آدمی کے لئے کوئی اپنی جان تک دیدینے کی جرأت کرے"۔

اس آیت میں دو باتیں خاص طور پر قابل لحاظ ہیں :۔ ایک تو ہے دشمنوں کے لئے جان نثار کرنا اور دوسری اس امر کا اظہار کہ مسیح کا بدکاروں اور مخالفوں کے لئے اپنے تئیں قربان کرنا خدا کی محبت کا مکاشفہ تھا۔ لیکن یہ ہو کیسے سکتا تھا؟ اِن لفظوں کے معنی کیا ہوں گے ؟ کیا خدا اور مسیح کسی نہ کسی طرح بالذّات ایک تو نہ تھے ؟ کیا یہ درست نہیں کہ خدا مسیح میں دُنیا کو اپنے سے ملا رہا تھا ؟ (۲۔کرنتھی ۵ : ۱۹) فی الحقیقت یسوع کی جان نثاری الٰہی محبّت کا فعل تھا۔ اور دُنیا میں یہ سب سے زیادہ عجب شئے ہے۔ خدا کی محبت اور مسیح کی محبّت امرِ واحد ہیں۔ اور گنہگاروں کی خاطر موت تک مسیح کی محبّت اُن کے لئے خدا کی محبت کا معیار ہیں۔

پس خدا کے نزدیک جان نثاری ممکن ہے۔ اور مسیح کے نجات بخش فعل کے ذریعے سے یہ جان نثاری تکمیل کو پہنچی۔ اگر یہ تکمیل کو نہ پہنچتی تو میزانِ اخلاق میں خدا انسان سے کمتر اُترتا۔ کیونکہ دُنیا میں محبّت سب سے افضل ہے۔ کاش کہ لوگ اس کو مان لیتے ؟

ہم اپنے مضمون سے دور نہ نکل جائیں۔ یعنی اس سے کہ "موت تک محبّت" انسانی زندگی کا سب سے افضل نظارہ ہے خاص کر جب یہ

محبّت ایسے شخص کے لئے کام میں آئے جو اُس کا مستحق نہیں اور نہ اُس کی قدر جانتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ لازم ہُوا کہ ابنائے آدم میں سے جو سب سے افضل نمُونہ کا شخص اور ایسا نبی تھا جس نے اپنی زندگی اور اعمال کے ذریعے ایسا ہی کلام کیا۔ جیسا کہ وُہ اپنے مُنہ سے کرتا تھا تاکہ وُہ جلال کے اُس اعلیٰ ترین تاج کو مَوت کے ذریعے سے حاصل کرے۔ اس نقطۂ خیال سے بھی یہ بخوُبی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر اسلامی رائے مسیح کی مَوت کے بارے میں دُرست ہو تو یسُوع کی زندگی کیسی ناکامل اور ناقص رہتی۔ جو کوئی اِس بنا پر مسیح کی مَوت کا انکار کرتا ہے کہ جس سے مسیح کی بزرگی و عزّت پر حرف آئے تو حق یہ ہے کہ وُہ صداقت کو سمجھتا ہی نہیں۔ اب ہم بھی رسُول کی طرح اِس اِقرار کو دُہراتے ہیں کہ یہ محبّت حقیقی اور بیرُوں از قیاس ہے۔ اور اس کے آگے ادب سے سر جھکانا ہم پر عین فرض۔

تیسرا پہلو

مسیح کی موت "بہادرانہ رہنمائی" کا فعل

عُمدہ افسر ہونے کی مقدم شرط یہ ہے کہ وُہ جنگ کے خطرات مشقّت اور تکلیفات میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ شریک حال رہے۔ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۵ء کی جنگِ عظیم میں برطانوی خندقوں میں یہ امر نمایاں تھا کہ افسر اور سپاہی بالکل ایک دل اور ایک جان تھے۔ ہر شئے میں افسر سپاہیوں کے ساتھ شریک تھے۔ بلکہ سپاہیوں سے بڑھ کر خطرات اور موت کا سامنا کرتے تھے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جن سپاہیوں کی کمان اُن کے سپرد تھی وُہ حد سے زیادہ اُن کو پیار کرنے لگے۔ اور ہر طرح کے خطرے میں جان دینے کے لئے ہر جگہ اُن کے ساتھ جانے کو راضی تھے۔ اور صرف انگریز افسروں ہی کا یہ خاص وتیرہ نہ تھا۔ برعکس اسکے پرمسل (PRZEMYSL) کے مفتوح ہونے کے بعد دُنیا کو یہ سن کر سخت حیرت ہُوئی کہ قلعہ بند فوج تو تھکی ماندہ اور مُصیبت زدہ نظر آتی تھی۔ لیکن افسر ہٹے کٹے اور تر و تازہ۔ جب فوج چوہے اور چھپکلیاں کھا کر گزران کر رہی تھی اُس وقت افسر لوگ بڑے بڑے ہوٹلوں میں گلچھرّے اُڑا رہے تھے۔ جب صُورتِ حال یہ ہو تو جائے تعجب نہیں کہ ایسے افسروں کی سرکردگی میں فوج سے کوئی قابلِ فخر فعل سرزد نہ ہُوا۔ خواہ دُشمن پر حملہ کرنے میں یا اپنے بچاؤ میں۔ ہر کامیاب راہ نما

کی زندگی میں یہ صفت پائی گئی کہ اُس کے پیرو یہ محسوس کرنے لگے کہ جو تکلیف اُن کو پہنچی۔ اُس سے زیادہ اُن کے راہ نما نے اُٹھائی۔ جب سکندرِ اعظم نے ہندوستان سے بابل کی طرف مراجعت کی تو اُس کو بلوچستان کے صحراؤں میں سے گزرنا پڑا۔ اور قلتِ آب کی وجہ سے اُس کی ساری فوج کو سخت تکلیف ہوئی۔ ایک روز جب تشنگی سے سب جاں بلب ہو رہے تھے ایک چھوٹا سا چشمہ اُن کو ملا۔ بدقت تمام ایک پیالہ پانی اُس میں سے دستیاب ہُوا اور وُہ پیالہ اُس جرنیل کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور جب اُس نے پیالے کو مُنہ لگایا۔ تو بھُوکے پیاسے تھرتھے سپاہیوں کی آنکھیں اُس کی طرف لگی ہوئی تھیں جرنیل نے وہ پانی کا پیالہ زمین پر اُنڈیل دیا۔ اور کہنے لگا کہ "جو تکلیف میری فوج اُٹھا رہی ہے میں اُس سے بچ نکلنا نہیں چاہتا"! بھلا جب سرِ لشکر ایسا ہو تو فوج کسی جگہ جانے سے بھی دریغ نہ کرے گی۔ اسی طرح داؤد نے پانی کا پیالہ "خداوند کے سامنے اُنڈیل دیا"۔ نپولین کی جنگوں میں ایک انگریز جرنیل کو زخم کاری لگا تھا۔ اور اُس کی پیاس بجھانے کے لئے ٹھنڈے پانی کا پیالہ اُس کے پاس لائے۔ لیکن اُس نے پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ پیالہ جا کر فلاں سپاہی کو دے دو جو قریب ہی زخمی پڑا تھا۔

اس مہم عظیم میں خداوند یسوع مسیح راہ نما سے کچھ کم نہیں۔ اِس مہم میں محنت۔ مشقت۔ دُکھ۔ خطرات اور موت کا سامنا ہے۔ یہ مہم شیطان ودنیوی۔ گناہ اور خود موت کے خلاف جاری ہے۔ ہم نے لیا یا کہ اس مہم میں وُہ راہنما وہ سرِلشکر ہے۔ کچھ تو اس لحاظ سے کہ نجات کا ابتدائی کام صرف وہی انجام دے سکتا تھا۔ اور کچھ اس لحاظ سے لہٰذا اس کام کے

جاری رکھنے کے لئے (خدا کی مرضی سے) اس کے پیروؤں کی ایک فوج کی ضرورت تھی - کیا آپ دیکھ نہیں سکتے کہ اخلاقاً بھی یہ امر کیسا لازمی تھا۔ اور مناسبت کے لحاظ سے کیسا اشد ضروری کہ یہ راہ نما، یہ سرلشکر دُکھ اُٹھائے اور مردِ غمناک اور رنج کا آشنا ہو - ورنہ وُہ کیسے توقع کر سکتا، کہ اُس کے پیرو دُکھ اُٹھانے پر راضی ہوں گے - چنانچہ لکھا ہے -

"کیونکہ جس کے لئے سب چیزیں ہیں اور جس کے وسیلے سے سب چیزیں ہیں، اُس کو یہی مناسب تھا کہ جب بہت سے بیٹوں کو جلال میں داخل کرے تو اُن کی نجات کے بانی کو دُکھوں کے ذریعہ سے کامل کرے" (عبرانی ۲: ۱۰) "کامل" یعنی پُورے طور سے اُس کام کے قابل - اُس کی اعلیٰ صفت اور خوبی یہ تھی کہ اس اعلیٰ مہم میں اعلیٰ درجے کی تکلیف سہے -

اناجیل کے آخری ابواب میں جن واقعات کا ذکر ہے - اُن پر بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں - لیکن ہماری التماس ہے کہ مذکورہ بالا نقطۂ خیال سے وُہ اس پر نظر ڈالیں - اور اگر وُہ ایسا کریں گے تو ان مظالم اور بیرون از بیان مصائب کو ذلّت اور شرم نہ جانیں گے - اور ہمارے ساتھ متفق الرّائے ہوں گے - کہ اُن میں اور اُن کے وسیلے ہی سے (جیسا کہ اُسی مقام میں مذکور ہے) "یسُوع کو جلال اور عزّت کا تاج پہنایا گیا" (عبرانی ۲: ۹) - بلکہ برعکس اس کے وُہ دُکھ اُسے اس جانکاہ مہم میں اعلیٰ درجہ کا قابل راہنما بناتے ہیں -

لیکن اگر ایسا ہو تو اسی نقطۂ خیال سے کیا یہ دُکھ مَوت پر مشتمل نہ ہوں گے ؟ کیونکہ مَوت اعلیٰ درجہ کا دُکھ اور اعلیٰ درجہ کی جان نثاری ہے جو کسی سپاہی سے طلب کی جا سکتی ہے - جو سپاہی مَوت تک وفادار رہے

اُن کی کہانیوں سے اب تک ہمارے دل کانپ اُٹھتے ہیں۔ اگر ہوریس (HORACE) شاعر یہ گا سکتا تھا۔ "اپنے ملک کے لئے جان دینا کیسا ذوالجلال اور شیریں فعل ہے۔" تو کتنا زیادہ اگر لفظ "ملک" کی جگہ ہم "خدا کی بادشاہی" پڑھیں، یہ سچ نہ ہوگا؟

یہی معترض جب کسی بڑے آدمی یا بڑے راہ نما کی نسبت پڑھتے ہیں کہ اُس نے بہادری سے اپنی جان دی۔ خندق میں لڑتے لڑتے مر گیا۔ واحد اُمّید میں قربانی دی اور سخت عذاب گوارا کیا اور اُس کی بہادری اور بالرّضا جان دینے سے آنیوالی پشتوں کو فائدہ اور نمونہ مل گیا۔ بھلا وُہ ایسے قصّوں کو پڑھکر اپنی زبانِ طعن کیسے دراز کر سکتے ہیں؟ بلکہ بجائے اعتراض کے تو یہ کہنا چاہیئے کہ اخلاقی طور پر یہ لازم امر تھا۔ اور کتاب میں یہ ایسا ہی بیان ہوا ہے "البتہ اُس کو دیکھتے ہیں جو فرشتوں سے کچھ ہی کم کیا گیا یعنی یسوؔع کو کہ موت کا دُکھ سہنے کے سبب" (عبرانی ۲: ۹)، کیونکہ فرشتے ایسا دُکھ سہنے کے قابل نہ تھے۔ اس لئے اگر اَور کسی وجہ سے نہیں تو محض جسمانی وجُوہ ہی کی بناء پر کلام مجسّم ہُوا اور دُکھ سہنے کے قابل ہوگیا۔ پھر آیت ۱۴ میں یوُں آیا ہے "پس جس صُورت میں کہ لڑکے خوُن اور گوشت میں شریک ہیں تو وُہ خود بھی اُن کی طرح اُن میں شریک ہُوا۔" (مخفی نہ رہے کہ متعدد افواج میں سرِ لشکر اہلِ فوج کو اکثر "لڑکے" کہہ کر ہی پکارتا ہے)۔ اور اس کی وجہ کیا ہوگی؟ "تاکہ موت کے وسیلے سے اُس کو جسے موت پر قُدرت حاصل تھی یعنی ابلیس کو تباہ کردے اور جو عُمر بھر موت کے ڈر سے غلامی میں گرفتار رہے اُنہیں چھُڑائے۔"

بے شک اس مُہم کے سرِ لشکر اور راہ نما کا یہ لازم فرض تھا۔ کہ موت میں اور موت کے وسیلے سے راہ نما بنے۔

لیکن شاید کوئی یہ کہے۔ کہ بڑا جرنیل اپنے تئیں یوں جوکھوں میں نہیں ڈالتا ہمیں تو ایک ایسے زندہ جرنیل کی ضرورت ہے جو اس مہم کو انجام تک پہنچائے۔

ایسا ہی ایک زندہ جرنیل تو ہمارے پاس ہے۔ مسیحی دین ناممکن اور متضاد اُمور کو ہمیشہ وابستہ کرتا جاتا ہے۔ ایک تو ہمارا ایسا راہ نما ہے جس نے اپنی جان موت تک انڈیل دی۔ اس غایت قربانی کی بار آور مثال ہمارے پاس ہے۔ اور پھر ہمارے پاس ایسا زندہ راہ نما بھی ہے جسے موت اُنگلی سے چھُو بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ اُس نے فرمایا "خوف نہ کر۔ مَیں اوّل اور آخر اور زندہ ہُوں۔ مَیں مرگیا تھا اور دیکھو ابدالآباد زندہ رہُوں گا، آمین۔ اور موت اور عالم ارواح کی کُنجیاں میرے پاس ہیں۔"

پس اِس راہ نما نے موت سے مغلوب ہو کر موت کو مغلوب کیا اور موت نے ایک لحظہ کے لئے اُس کو مغلوب کر کے اپنی طاقت ہمیشہ کے لئے کھو دی۔

چوتھا پہلو

مسیح کی موت

"موت کا مقابلہ کر کے موت پر غالب آنے والی"

پچھلی فصل میں ہم نے مسیح کی موت کی عام خوبی کو اس نقطۂ خیال سے بیان کیا کہ بحیثیت راہ نما اور سر لشکر ہونے کے اُس نے اپنی ذات میں وہ سب کچھ سہا جو اُس کے شاگردوں کے درپیش تھا۔ اور وہ بھی موت تک سہا۔ (کتاب اللہ میں لکھا ہے) کہ "اُس کو یہی مناسب تھا" کہ ہمارے "نجات کے بانی کو دُکھوں کے ذریعہ سے کامل کرے"۔ اس میں موت شامل ہے جیسا کہ باقی عبارت سے ظاہر ہے (عبرانی ۲: ۱۰)۔ لیکن اب ہم اس امر کی تحقیقات کریں گے کہ یہ مہم کیا تھی اور یہ دشمن کون تھا کہ جس کے ساتھ اس "بانی" اس سر لشکر نے معہ اپنی فوج یعنی پیروؤں کے جنگ کی؟ اس سوال کے جواب سے اُس کی موت کی ضرورت اور مناسبت اور بھی زیادہ واضح ہو جائیگی۔

یہ مہم گناہ اور موت کے سُلطان کے خلاف تھی، اُن انسانوں کی حمایت میں جو گناہ اور موت کی شریعت کے اسیر ہو چکے تھے۔

مندرجہ ذیل آیت پر غور کرو۔ "البتہ اُس کو دیکھتے ہیں جو فرشتوں

سے کچھ ہی کم کیا گیا۔ یعنی یسوع کو کہ موت کا دُکھ سہنے کے سبب جلال اور عزت کا تاج اُسے پہنایا گیا۔ تاکہ خُدا کے فضل سے وُہ ہر ایک آدمی کے لئے موت کا مزہ چکھے۔" (عبرانی ۲: ۹)

انسان نے موت کا مزہ چکھا۔ بلکہ اُس کے پیالے کو تہ تک چٹ کر گیا۔ بائیبل کے بیان کے مطابق یہ موت گناہ کا نتیجہ تھی اور ظلمت کی قدرت رکھنے والے کے وسیلے سے یہ گناہ دُنیا میں داخل ہُوا۔ طبقۂ نور سے ایک سپہ سالار ایک مخلصی دہندہ آیا تاکہ اپنی اسیر قوم کو چھڑائے۔ اب یہ مضائقہ نہیں کہ کوئی شخص یہ ایمان لائے (۱) کہ محض طبعی موت انسان کے گرنے کے وقت آ براجی۔ ورنہ انسان اس دُنیا میں اپنی آزمائش کا زمانہ گزار کر پُر جلال جہان میں منتقل ہو جاتا۔ یا (۲) یہ کہ یہاں محض طبعی موت مراد نہیں بلکہ اس کے دیگر خوفناک لوازمات بھی۔ مثلاً بیماری۔ درد۔ تاریکی اور خوف، اس وجہ سے انسان بشاشت، خوشحالی، آسان موت، یقین، ایمان، اُمید اور خوشی سے محروم ہو گیا۔ دونوں صورتوں میں خاص بات یہ ہے کہ اس بانی اور سپہ سالار کو ہر ایک شخص کے لئے موت کا تلخ پیالہ پینا تھا۔ تاکہ موت کو مغلوب کرے اور انسان کو اس کے نتیجۂ عذاب سے مخلصی دے۔ اس سے اس امر کی تشریح ہو جاتی ہے کہ اُس نے موت کا یہ تلخ پیالہ کیوں نوش کیا۔ اور موت بھی ایسی جو ہر طرح کے عذاب، ہر طرح کے خوف اور ہر طرح کی رُوحانی تاریکی سے گھری تھی۔ بلکہ جس میں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ آسمانی باپ نے بھی اُسے ترک کر دیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اُس نے یہ پُورا پیالہ پینا چاہا، نہ محض طبعی موت کا بلکہ اُس کا مع اُس کے دیگر لوازمات کے جو انسان کے گناہ کا براہِ راست نتیجہ تھے۔ اس موت کا سلطان خُدا نہیں بلکہ شیطان ہے۔

لیکن کیوں؟ کیا وُہ محض خُدا کے ارادے کے ایک اشارے سے بچ نہ سکتے تھے؟ خیر۔ ہم صرف اِسی بات کو دُہرائے دیتے ہیں کہ ہر نجات دہندہ کو محبّت مجبُور کرتی ہے۔ کہ جن خطرات سے وُہ خطروں سے گھرے ہُوئے اشخاص کو چھُڑانا چاہتا ہے، وُہ اُن کا خود سامنا کرے۔ اگر وُہ شخص خاک میں پڑا ہے۔ تو یہ نجات دِہندہ خاک تک جُھک جائے گا۔ اگر وُہ ڈُوب رہا ہے تو یہ سمندر میں کُود پڑے گا۔ اگر وُہ آگ میں پڑا ہے تو یہ اُن شعلوں میں جا کُودے گا۔

شاید کوئی یہ کہے۔ اچھّا ایسا ہی سہی۔ لیکن مرنے کی کیا ضرُورت تھی؟ عقل تو یہ چاہتی ہے کہ ایسا نجات دہندہ اپنی جان کی حفاظت کرے! نہیں۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ خطرات میں مبتلا اشخاص کے بچانے کی خاطر بہت نجات دہندگان کو اپنی جان دینی پڑی۔ اُسے معلوم تھا کہ وُہ اپنی جان نثار کر رہا تھا اور بعض ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں محبت کا کمال نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ہم پیشتر بیان کرچکے۔ کم از کم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس مخلصی کی جنگ میں یسُوع کو مرنا ضرُور تھا۔ اور مزید برآں اخلاقی اور رُوحانی مخلصی محض طبعی مخلصی سے متفرق ہے۔

پہلی صُورت میں ساری خُوبی اس امر میں داخل ہے کہ مخلصی دینے والا اس سارے خطرے، تکلیف اور مصیبت میں سے گُزرتا ہے جس سے کہ وُہ گرفتارانِ بلا کو مخلصی دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ اُس دُشمن کی شکست اِس بات پر مشتمل ہے کہ جو کچھ وُہ کرسکتا ہے، اُس کو کر لینے دیں۔ تاکہ وُہ اپنی مرضی پُوری کرلے۔ اور پھر اُس پر یہ ظاہر کیا جائے کہ باوجود اس سبب کے بھی اُس کو شکست ملی ورنہ (۱) وُہ دشمن یہ دعویٰ کرے گا۔ کہ میرے پاس ابھی کچھ

اور ہتھیار بھی باقی تھے جن کے ذریعے سے وُہ اس مخلصی دینے والے کو شکست دے سکتا تھا۔ اور (۲) جو اُس مصیبت میں پڑے کراہ رہے ہوں وُہ یہ کہیں گے کہ ان کے مخلصی دینے والے نے وُہ دُکھ اُٹھائے ہی نہیں جو ان کو اُٹھانے پڑے۔ اس لئے اُس مصیبت کی کمر شکستہ نہ ہو گی۔ ان ہر دو وجُوہ کی بناء پر یسُوع بالرضا مَوت کے سائے کی تاریک وادی میں سے گزرا اور ہر دُکھ اور مصیبت سہی۔ یعنی اس کے طبعی۔ اخلاقی اور رُوحانی عذابوں کو۔ اور پھر آفتاب اور روشنی میں آیا۔ دُشمن کو قطعی شکست اُسی وقت ہوئی جب اُس کو ایک لحظہ کے لئے غالب آنے کا موقعہ ملا! گو یہ عجیب معلوم ہو لیکن ہر صاحبِ فکر پر یہ بالکل واضح ہے۔

مَوت کے سُلطان نے جو کچھ وُہ اس بہر لشکر سے کر سکتا تھا کیا اور ناکام رہا۔ جو شگاف اُس نے اس فصیل میں کر دیا۔ اُس کے پیرو اُس میں سے ہو کر اُس کے پیچھے جا سکتے ہیں۔ انسان کے نمائندہ نے ہر ایک آدمی کے لئے "مَوت کا مزہ" چکھا۔ اس لئے ہر ایک آدمی اُس پر ایمان رکھنے کے وسیلے مَوت پر غالب آسکتا ہے۔ تبھی تو اس مقام میں آگے چل کر یہ لکھا ہے "پس جس صُورت میں کہ لڑکے خون اور گوشت میں شریک ہیں تو وُہ خُود بھی اُن کی طرح اُن میں شریک ہُوا تا کہ مَوت کے وسیلے سے اُس کو جسے مَوت پر قدرت حاصل تھی۔ یعنی ابلیس کو تباہ کر دے۔ اور جو عُمر بھر موت کے ڈر سے غلامی میں گرفتار رہے اُنہیں چھُڑا لے۔"

اب تو یہ بات بالکل صاف ہو گئی۔ لڑکے گوشت اور خُون میں معہ اُن سارے امراض کے شریک ہوئے جو اُنہیں ورثہ میں ملے تھے۔ اس لئے اُن کے بانی کو بھی ضرُور ہُوا کہ اُن میں شریک ہو اور مَوت میں سے گزرے۔ یہ

ایک بڑا مُعمّا ہے اور بظاہر خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اب ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ موت کے سُلطانِ اعظم کو وُہ اب خاک میں ملا سکتا ہے۔ اُس کے زور و اختیار کو توڑ سکتا، اور یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اُس کی اعلیٰ سے اعلیٰ طاقت خُدا کی قُوّت سے ادنیٰ ہے۔ بلکہ ایمانداروں کی کامل قوّت سے بھی کم۔ اور جو لوگ تاریکی کے اس اختیار والے کی دائمی غلامی میں پڑے گمراہ رہے تھے اُن کو چھڑا سکتا ہے۔ یہ بالکل صاف و صریح ہے۔ محض ظاہرا کمزوری کے باعث مسیح کی موت کا انکار کرنا کیسی نادانی ہوگی۔ یہ تو صاف روشن ہو گیا کہ ایسی رائے بالکل بودی اور بوسیدہ ہے۔ اور اس ظاہرا ذلّت کو دیکھ کر جو اس کا انکار کرتا ہے وُہ ادراک و جدّتِ طبع سے خالی ہے۔ بلکہ ہم اُسے دیکھیں جس نے جُراَت کر کے یہ ساری باتیں سہہ لیں۔ اور "جلال و عزّت" کا تاج حاصل کیا اور "ہر نام سے اعلےٰ نام اُس کو بخشا گیا۔"

پانچواں پہلو

مسیح کی موت کا رشتہ گناہ سے جنگ کرنے کیساتھ

گذشتہ فصل میں ہم نے اِس خیال کا اظہار کیا کہ اُس اعلیٰ انسان کے لئے ضرور تھا، کہ موت اور موت کے سلطان کے ساتھ جنگ کرنے میں وُہ خود مرجائے۔

موت کی تلخی کا انحصار گناہ پر ہے۔ "اے موت تیرا ڈنک کہاں؟ موت تیرا ڈنک گناہ ہے"۔ جیسا ہم نے دیکھا موت کے خلاف مہم دراصل گناہ اور تمام ناراستی کے خلاف خُدا کی مقدس شریعت سے انحراف اور بغاوت کرنے والوں کے خلاف مہم تھی۔ اور اس ہی نجات دہندہ کی موت لابدی اور اٹل تھی، اور وُہ بھی کئی ایک وجوہ سے۔

اوّل۔ راستباز انسان دُنیا کے خلاف

ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ جو لوگ اس دُنیا میں راستبازی پر عمل کرنے کی خاطر ہر طرح کے خطروں میں پڑتے ہیں، اُن کا انجام اکثر کیا ہوتا ہے۔ وُہ نفع کو قُربان کرتے، ہر طرح کا نقصان اُٹھاتے، ہنسی میں اُڑائے جاتے، عوام اُن سے کنارہ کشی کرتے، وُہ ستائے جاتے، خاندان یا سماج سے خارج

کئے جاتے، کبھی اُن پہ جبر و ستم ہوتا اور کبھی جان سے جاتے یہ آخری بات سب کا سرتاج ہے۔ لیکن اس سے اس سارے عمل اور کارروائی کا حال فاش ہو جاتا ہے۔ دُنیا ایسی راستبازی سے عداوت رکھتی ہے جو دُنیا کی بدی کا راز افشا کرتی ہے اور اس کا مقابلہ جان توڑ کر کرتی ہے۔ موت یہاں اس کا لازم انجام ہے۔ جس آدمی کو راستبازی کی خاطر تھوڑی قربانی بھی کرنی پڑتی ہے وُہ اس نقطۂ خیال سے موت میں سے گزرتا ہے۔ لیکن جو مثالی یعنی نمونہ کا شخص ہو، اُس پر یہ واجب ہے کہ اپنی ذات میں اس عمل کی غایت کو ظاہر کرے۔ وُہ فی الواقع مر جائے۔ یہ تو ہنسی کی بات ہوگی کہ شہید تو اپنے ضمیر کی پاس داری میں جان دے اور کامل اور راستباز شخص اعلیٰ شہید کا درجہ نہ پائے؟ یہ ناممکن ہے اس لئے ہم پھر گھوم گھوم کر اسی نقطہ پر آجائیں گے کہ مسیح کو اس نقطۂ خیال سے مرنا ضرور تھا۔

نہ صرف بائبل نے بلکہ انسانی تجربہ نے بھی اِس نقطہ کو آشکارا کر دیا ایک عجیب عبارت میں جو بمنزلۂ نبوّت ہے۔ افلاطون نے یہ بیان کیا کہ جب ایک کامل راستباز شخص کی مٹ بھیڑ دُنیا کے ناراست لوگوں کے ساتھ ہو جو نہ تو مفاہمت پر آمادہ ہو اور جو چٹان کی طرح اپنی بات پر ڈٹا رہے تو اُن میں ایک بڑی کشمکش ہوگی۔ جس میں اخلاقی فتح تو اُس راستباز کو نصیب ہوگی لیکن جسمانی فتح اُس کے مخالفین کے انبوہ کو۔ یہ کسی بات پر قائم نہ رہیں گے اور کسی بات سے راضی نہ ہوں گے، جب تک کہ اُس کو ذلیل کرکے مار نہ ڈالیں۔ سُقراط فلاسفر نے اپنے ضمیر کی خاطر ایسی موت گوارا کی اور افلاطون کو یہ خیال غالباً وہاں سے پیدا ہُوا۔ لیکن اس نبوّت کی پُوری تکمیل یسُوع نے ہی کی۔ وُہ عبارت یہ ہے:۔

"راستباز شخص بہترین شخص ہو لیکن وہ بدترین سمجھا جاتا ہو پھر دیکھیں کہ آیا اُس کی نیکی اُسے نادانی اور اُس کے نتائج سے محفوظ رکھے گی، یا نہیں۔ بالفرض ایسا شخص اپنی موت کے وقت تک ایسا ہی عمل کرتا ہے تو وہ تمہیں بتائیں گے کہ راستباز شخص جو ناراست سمجھا گیا اُس کو کوڑے پڑے۔ شکنجے میں کھینچا گیا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے۔ اُس کی آنکھیں گرم گرم آہنی سلاخوں سے پھوڑی گئیں اور آخر کار ہر طرح کا دُکھ دینے کے بعد وہ صلیب پر کھینچا گیا۔"

ناظرین کو خود بخود معلوم ہو جائے گا اور بتانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ کہ راستبازانہ اور ناراست دُنیا کے درمیان جنگ میں اس سارے مضمون کا راز اور لبِ لباب یہ ہے کہ یہ راستباز محض اپنی راستبازی سے مسلّح پایا جائیگا جیسے ہی وہ اس اسلحہ پر دیگر اسلحہ ایزاد کرے گا۔ فی الفور وہ رازہ، وہ جادو ٹوٹ جائے گا۔ وہ اُس ذاتی اِستحقاق، اُس صِلہ سے (جس کیلئے وہ جنگ کر رہا تھا) محروم رہے گا اور اگر وہ جسمانی تشدد یا اعجازی امداد سے کام لے تو سمجھو کہ وہ اخلاقی طبقے ہی سے نکل گیا اور وہ خوبی جاتی رہی۔ اسی وجہ سے یسُوع مسیح کے لئے یہ ناممکن تھا کہ اس دُنیا کی ناراستی کے ساتھ جنگ کرنے میں فرشتوں کے لشکر (شیطان نے تو یہ آزمائش اُس کے سامنے پیش کی تھی) یا معجزوں (جیسا کہ گتسمنی کے باغ میں شیطان نے اور صلیب پر یہود نے اُس کو آزمایا) سے مدد لے، ہرگز نہیں۔ اُس نے بے داغ زندگی اور کامل اور راست شہادت سے دُنیا کی سخت عداوت کا مقابلہ کیا۔ جسمانی طور پر دُنیا اُس کو قتل کر سکتی تھی اور اُس نے اُسے قتل کر بھی دیا۔ لیکن وہ پھر جی اُٹھا تاکہ وہ ظاہر کرے کہ اخلاقی فتح ہی کامل فتح ہے۔ اور جو رُوح

ایسی فتح حاصل کرے وُہ فنا پذیر نہیں۔ لیکن ناظرین پر یہ واضح ہو گیا کہ نمونہ کا راستباز شخص ہونے کی حیثیت سے یسُوع کے لئے مَوت اٹل تھی۔

دوم۔ گُناہ بے حجاب اَور بذاتِ خود مجُرم ہُوا

اس سے یہ نتیجہ نِکلا کہ گُناہ نے اپنے آپ کو خود بے حجاب کر دیا۔ اور دُنیا کو دِکھا دیا کہ اُس قدُوس کے ساتھ اس مُہلک جنگ میں اُس کا کیا حال ہُوا۔ کیونکہ اکثر گُناہ زیرِ نقاب کام کرتا رہا۔ اور اکثر اپنی شرارت اور بدی کو کسی نہ کسی تدبیر سے چھپاتا رہا۔ بعض اوقات تو اپنے تئیں نہایت حسین دِکھایا، لیکن مسیح کی صلیب پر اُس کا ننگ ظاہر ہو گیا جو بے گُناہ تھا۔ اُس کو اُس نے ہلاک کرنا چاہا۔ ناراستی سے اُس راستباز کو قتل کرنے کی کوشش کی اور اُس کے ذریعے خود راستبازی کا خُون کرنے کا ارادہ کیا۔ یُوں وُہ سارے نفرت انگیز اور گھناؤنے جرائم جو اس دُنیا میں سرزد ہُوئے اُن سب کا کمال اُس سلوک میں پایا جاتا ہے جو مسیح سے ہُوا۔ یُوں گُناہ نے اپنا نقاب اور حجاب اُتار پھینکنے سے اپنی عُریانی کو ظاہر کر کے دِکھا دیا کہ میں کیا ہُوں۔ گھناؤنا، خُونی، خُدا کا دشمن! اس لئے اس جنگ کے آخر کے قریب مسیح نے یہ فرمایا "اب دُنیا کی عدالت کی جاتی ہے۔ اب دُنیا کا سردار نکال دیا جائے گا۔" (یُوحنا ۱۲: ۳۱)

یُوں گُناہ نے اپنے تئیں خود مجُرم ثابت کر دیا۔ "جو اُس پر ایمان نہیں لاتا اُس پر سزا کا حکم ہو چُکا۔ سزا کے حُکم کا سبب یہ ہے کہ نُور دُنیا میں آیا ہے۔ اور آدمیوں نے تاریکی کو نُور سے زیادہ پسند کیا۔ اِس لئے کہ اُن کے کام بُرے تھے۔"

کیا اِس میں خدا کے اس راز کی کُنجی نہیں کہ اُس نے یسوع کی مَوت کے وسیلے گُناہ پر سزا کا حکم دیا۔ اب ہم تیسری وجہ کی طرف رجُوع ہوں گے لیکن اِس وقت ہم صرف اتنا یاد دِلایا چاہتے ہیں کہ خُدا نے گُناہ پر سزا کا حُکم دیا محض اس طریقے سے کہ گُناہ خود اپنے پر سزا کا حُکم دے کہ اُس نے اُس کامل قدُّوس پر اپنا غضب اُنڈیلا اور در اصل اپنے آپ کو صلیب پر چڑھایا۔ گُناہ پر سزا کا حُکم ملنے کا اس سے کوئی دُوسرا طریقہ تھا ہی نہیں۔ اِس لئے ہم پھر یہ کہنے پر مجبور رہیں کہ انسانیّت کے سرکشکہ خُدا کے قدُّوس کو مرنا اٹل تھا۔

سوم:۔ گُناہ پر خُدا کی طرف سے سزا کا حکم

ہم ذکر کر آئے ہیں کہ گناہ پر فتویٰ لگانے کے لئے مسیح کا طریقہ یہ تھا کہ اُس نے مجسّم کلام خُدا پر گناہ کو اپنا سخت غضب انڈیلنے دیا۔ اب ہم آخر میں اس اعلیٰ پہلو پر اپنی توجّہ قائم کریں گے کہ خُدا نے مسیح میں گُناہ پر سزا کا حُکم دیا اور اس طرح گنہگاروں کی ساری نسل کے لئے کفّارہ دیا" خُدا نے اپنے بیٹے کو گناہ آلودہ جسم کی صُورت میں اور گُناہ کی قُربانی کے لئے بھیج کر جسم میں گناہ کی سزا کا حُکم دیا" (رومیوں ۸ : ۳) انسانی جسم نے گُناہ کیا اور انسانی جسم ہی نے گُناہ پر سزا کا حکم دیا۔ لیکن جیسا ہم اوپر بیان کر آئے سزا کے حُکم کا ایسا اظہار پاک انسانی جسم کے ذریعے سے ہی ہو سکتا تھا۔ ایسے شخص کے ذریعے سے جس نے محبّت اور ترس سے اسی مقصد کی خاطر جسم کو اختیار کیا۔ اور مسیح میں خُدا کی محبّت مشتمل ہی اس بات پر تھی کہ مسیح اپنی راستبازی اور گُناہ کی تصوّرواری کے اظہار پر راضی ہو۔

تھی۔ اس میں خُدا اور گُنہگاروں کا ملاپ ہُوا۔ گنہگار راستباز ٹھہرایا گیا، اور گُناہ دُور کیا گیا۔ جو شخص بیدار شدہ ضمیر کے ذریعے صلیب پر غور کرتا ہے وُہ اس فعل کے ذریعے اُس مُقدّس اور پُر محبّت خُدا کی حقیقت اور راستبازی کی صحیح ذات، گُناہ کی حقیقی فطرت اور اپنی صحیح حقیقت کو پہچان لیتا ہے۔ اس لئے خُدا نے جو فتویٰ گُناہ پر اور انسان پر نافذ کیا تھا اُس کو وُہ اپنے پر وارد کرتا ہے۔ اور ایسا کرنے ہی کے ذریعہ اُس کو مُفت مُعافی ملتی ہے۔ ایسا کیوں؟ اِس لئے کہ اب یہ خطرہ نہ رہا کہ معافی کو کوئی بے پروائی اور بے توجہی سمجھ لے۔ اور نہ یہ اندیشہ رہا کہ وُہ اُسے نقصان پہنچائے یا گُناہ میں اُس کو مستحکم کردے۔ بلکہ برعکس اس کے جس قُدسیّت کا ایسا مکاشفہ حاصل ہُوا اُس کی وُہ تعظیم کرتا اور جو محبّت ایسے طور سے ظاہر ہُوئی اُس کے آگے اُس کا دل پگھل جاتا ہے۔ اُس پر ایمان رکھنے کے وسیلے وُہ مسیح کے ساتھ مصلوب ہوگیا۔ اور گُناہ اور دُنیا کے اور شیطان کے لئے وُہ صلیب پر مر گیا۔ اور ایمان ہی کے وسیلے سے مسیح کے ساتھ جی اُٹھا۔ اور اب جو وُہ جیتا ہے تو صرف خُدا کے اور پاکیزگی کے لئے جیتا ہے۔

اور اس لئے بڑے سے بڑے گنہگار کو بھی صلیب کے ذریعے سے اطمینان حاصل ہو سکتا ہے خواہ ہمارے گناہوں کی کثرت کتنی ہی ہو اور وُہ خواہ کیسے ہی شدید کیوں نہ ہوں۔ اُن کا بوجھ خواہ کیسا ہی تلخ ہو مسیح نے ان سب کا بلکہ ان سے بھی زیادہ کا مقابلہ کیا۔ بلکہ خُود گُناہ اور اُس کے سُلطان کا مقابلہ کیا۔ اس لئے خواہ کوئی کیسا ہی مُجرم کیوں نہ ہو وُہ ایمان کے وسیلے اُس گُناہ بردار کے ساتھ اتحاد کرکے اپنے گُناہوں سے ہمیشہ

کے لئے مخلصی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جو ایسا نہیں کرتا اُس کے لئے خطرہ لاحق ہے کہ وہ اُس گناہ میں مشارکت کا مرتکب قرار دیا جائے جس نے اُس قدوس کو قتل کرنے کی کوشش کی اور جسے اُس قدوس نے مغلوب کیا اور جسے وہ ایک دن نیست کر دے گا۔ اور اُس کے ساتھ شامل ہو کر وہ گنہگار خود بھی ہلاک ہو گا ؂

پی۔ آر۔ بی۔ ایس پریس لاہور میں باہتمام مسٹر ڈی۔ ایس۔ کے فضل
سیکرٹری پنجاب رلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور چھپ کر شائع ہوئی۔